© rasailojaraid.com

خرد کی نامسلمانی سے فریاد

یہ کائنات جس میں ہم رہ رہے ہیں اور جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہے، سائنس دانوں کے نزدیک تین مسلمہ مرحلوں میں تقسیم ہے۔ کائنات کے یہ تین ارتقائی مراحل مادہ، حیات اور شعور ہیں۔ ان کی مناسبت سے علم بھی تین بڑے شعبوں میں تقسیم ہے۔

۱۔ مادے کی دنیا سے متعلق علم یا مادی سائنس (PHYSICAL SCIENCES) ان میں فزکس، کیمسٹری، علم طبقات الارض اور علم نجوم وغیرہ شامل ہیں۔

۲۔ زندگی سے متعلق علم (BIOLOGICAL SCIENCES) ان میں علم نباتات، علم حیوانات اور ان کی مختلف شاخیں ہیں۔

۳۔ شعور کی دنیا سے متعلق علم یا نفسیاتی سائنس (PSYCHOLOGICAL SCIENCES) جو عرفِ عام میں انسانی اور معاشرتی سائنس کہلاتی ہے۔ اسے مجموعی طور پر سوشل سائنس یا سوشل فلسفہ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس کی مختلف شاخوں میں سیاسیات، اخلاقیات، معاشیات، قانون، تاریخ، آرٹ تعلیم اور نفسیات شامل ہیں۔

علم کے یہ تینوں شعبے نہ صرف ایک ہی مضمون، انسانی سائنس کی مختلف برانچیں ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کے جزو لاینفک ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا مقصد انسانی فطرت کا مطالعہ اور اس کی تشریح کرنا ہے اور انسان کی فطرت اپنی اصل کے اعتبار سے ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔ کیونکہ انسان بیک وقت سیاست دان، ماہر معاشیات، معلم اخلاق، دانشور اور جمالیاتی ذوق کا حامل ہو سکتا ہے۔

مغربی اربابِ علم نے مادی علوم میں حیرت انگیز ترقی کر کے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ آج وہ جوہر کو توڑنے اور اس کے ذریعے ہیروشیما جیسے شہر کو پل جھپکنے میں برباد کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ خلا میں زمین کے گرد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چکر لگانے اور انتہائی نزدیک سے وینس جیسے سیارے کے فوٹو اُتارنے میں بھی ماہر ہیں، لیکن .... حیاتیاتی علوم میں انہوں نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔ گو اس میدان میں وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے پر آمادہ نہیں۔ لیکن معاشرتی علوم کے لئے انہوں نے بالکل تگ و دو نہیں کی۔ چنانچہ مغرب کے جدید مفکر اور فلاسفر اس میدان میں عدم ترقی پر کھل کر کفِ افسوس مل رہے ہیں۔ وہ متفقہ طور پر ان باتوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ :

ا۔ انسانی اور معاشرتی علوم اس وقت مکمل طور پر بدنظمی اور انتشار کا شکار ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک سائنس بھی اتنی ترقی نہیں کر سکی کہ اسے مربوط، عقلی اور اس انداز سے مرتب کیا جا سکے جو ایک سائنس کی خصوصیت ہوتی ہے اور جس کی بدولت اسے سائنس کہا جاتا ہے۔

ب۔ ان علوم کی ترقی اور مناسب طریق سے ان کا انضباط موجودہ انسانیت کی شدید ترین ضرورت ہے۔ اگر یہ ضرورت تیزی سے پوری نہ کی گئی تو مغربی تہذیب کے زوال بلکہ مکمل تباہی کا خطرہ ہے۔

ج۔ اب تک یہ علوم مطلوبہ معیار تک اس لئے ترقی نہیں کر سکے کہ ان کی تدریج و ارتقا کے لئے فطرتِ انسانی کا صحیح اور باقاعدہ مطالعہ بنیادی شرط ہے جب کہ مغربی مفکرین کا مطالعہ بڑا ہی محدود اور ناقص ہے۔

اس بیان کی تائید میں بہت سے مشہور مفکرین کی شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں نمونے کے طور پر صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ معروف ماہر نفسیات اور بہت سی کتابوں کے مصنف میکڈوگل اپنی شہرۂ آفاق تالیف "WORLD CHAOS" میں لکھتے ہیں۔

"فطرتِ انسانی کے مطالعہ سے غفلت اور لاپرواہی نے ماضی اور حال میں بھی ہمیں معاشرتی علوم میں ترقی کرنے سے باز رکھا ہے۔ یہ علوم ہمارے زمانے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ اُن کی زبوں حالی سے ہماری تہذیب کے تنزل بلکہ مکمل تباہی کا خدشہ پیدا ہو گیا ہے"

"ہم نفسیات، معاشیات، سیاسیات، فقہ، عمرانیات اور اسی نوع کے دوسرے معاشرتی علوم کی باتیں تو بہت کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان علوم میں ہم بہت پیچھے ہیں۔ ان علوم کی بہت سی گہرائیوں سے ہم ابھی تک نابلد ہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیب کو زندہ و باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان گہرائیوں سے گزرنا ہو گا۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"میں نیک نیتی سے اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ اپنی ثقافت کا توازن بحال کرنے کے لئے ہمیں انسانی فطرت اور معاشرتی زندگی کا اس سے زیادہ مطالعہ کرنا ہوگا، جواب تک ہم کر چکے ہیں"۔

"جدید تہذیب کو درپیش سنگین خطرات سے محفوظ رکھنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم پورے ذوق و شوق اور انہماک سے معاشرتی علوم کو فروغ دیں تاکہ وہ حقیقی معنوں میں انسانی اور معاشرتی علوم بن جائیں۔ ان علوم کو صحیح انداز میں مرتب کرنے اور فروغ دینے کی آج جتنی ضرورت ہے شائد ماضی میں کبھی نہ تھی"۔

"اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ مغربی تہذیب کے تحفظ کی عملی صورت کیا ہے تو میرا مختصر جواب ہوگا کہ اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو اپنے تمام اختیارات اور وسائل اس بات کے لئے وقف کر دیتا کہ ارباب علم و دانش اپنی تمام تر توجہ مادی علوم کے بجائے معاشرتی علوم پر مرکوز کر دیں"۔

ایک اور مشہور ماہر نفسیات سکنر (SKINNER) اسی سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"سائنس نے اوٹ پٹانگ طریقے سے ترقی کی ہے۔ بیشک سائنس کے آسان مسائل کو پہلے حل کر کے ہم نے بے جان اور بے کیف نتیجہ تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ لیکن اس کے بعد پیش آنے والے معاشرتی مسائل کے بارے میں ہم نے کوئی تیاری نہیں کی۔ اسے سائنس کی ترقی کا مرحلہ نہیں کہہ سکتے۔ جب تک اس میں معاشرتی سائنس کو شامل نہ کیا جائے۔ کیونکہ فقط اس صورت میں مطلوبہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں"۔

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن مغربی علماء نے مادی علوم میں عروج و ارتقاء کی آخری منزل کو چھو لیا ہے۔ حیاتیاتی سائنس میں بھی کسی حد تک ترقی کر لی ہے۔ انسانی اور معاشرتی علوم میں وہ کیوں نام کو بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ جب کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ معاشرتی علوم کو مناسب ترقی نہ دی گئی تو ان کی تہذیب کا جنازہ نکل جائے گا؟ کیا وجہ ہے کہ جو سائنسدان مادہ کے غیر مرئی ایٹم کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں وہ معاشرتی دنیا کے غیر مرئی جوہر..... انسانی شعور، کی حقیقت کو نہ پا سکے۔ حالانکہ اوّل الذکر کے مقابلے میں آخر الذکر کی ماہیت سے آگاہی زیادہ ضروری اور اہم ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس پسماندگی کا سبب مغربی ذہن کا وہ مخصوص اندازِ فکر ہے جس میں جملہ عقلی اور علمی نظریات کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے۔ خواہ ان کا تعلق مادی اور حیاتیاتی علوم سے ہو یا معاشرتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علوم سے ۔ ایسے نظریات جو کسی بھی طریقے سے خدا کے تصور کی وکالت یا رہنمائی کرتے ہوں ۔ یہ ذہنی کیفیت جسے اصطلاحی زبان میں " فکری لادینیت " (INTELLECTUAL SECULARISM) کہتے ہیں تمام مغربی دانشوروں میں عام ہے۔ خواہ وہ خدا کے قائل ہوں یا منکر یا کسی طور سے مذہب پسند۔ منکرین خدا کا یہ ذہنی رجحان تو قابل فہم ہے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ جو لوگ خدا کو خالقِ کائنات سمجھتے ہیں وہ بھی اس ذہنی بیماری میں مبتلا ہیں ۔

کسی چیز کی بنیادی اصلیت کے بارے میں علم، اس چیز کے بارے میں مجموعی علم کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے جس کی ہم فطری طور پر خواہش رکھتے اور اپنا مقصد ٹھہراتے ہیں۔ عام آدمی کی رائے میں گلاب کے پھول کی پیدائش کا کوئی خاص مقصد نہیں، لیکن مذہبی انسان کے نزدیک گلاب کے پھول کو خدا تعالےٰ نے اپنی لامحدود طاقت، حکمت، تخلیقی قوت اور ذوقِ جمال کو آشکارہ کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ایک دہریے کے خیال میں گلاب کا پھول مادی اور میکانکی قوتوں کے خود بخود حرکت کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ بعض اوقات ہم کسی چیز کو سمجھ نہیں سکتے لیکن ہر چیز کے ساتھ کوئی نہ کوئی بنیادی اصل ضرور وابستہ کرتے ہیں۔ اگر ہم اس چیز کے ساتھ اس کی "صحیح" بنیادی اصلیت منسوب نہ کر سکیں تو ہماری فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ کوئی غلط اصلیت اس سے منسوب کر دیں۔ اس صورت میں اس چیز کے متعلق ہمارا علم غلط فہمی پر مبنی ہوتا ہے۔

یہ درست ہے کہ سائنسدان کو قوانینِ فطرت کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر چیز کی وضاحت کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن اگر خدا تعالیٰ واقعی کائنات کا خالق اور اس کا سرچشمہ ہے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی خوبیاں اور اوصاف کائنات کے ضابطوں میں یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی قوانین میں شامل ہونے چاہئیں اور انہیں ایسا بنانا چاہیئے جیسا کہ ایک مصور اپنی تصویر میں انسان کی ذہنی اخلاقی اور جمالیاتی خوبیاں پیدا کر دیتا ہے اور اسے بالکل آدمی کی مانند بنا دیتا ہے ۔ بعینہٖ ——— جیسے بیج کی جملہ خصوصیات اس سے پیدا ہونے والے درخت کے پتوں، شاخوں اور پھولوں کی ساخت اور قامت میں پائی جاتی ہیں اور انہیں ان کے اصل روپ میں پیش کرتی ہیں ۔ اسی طرح قوانین فطرت اور فطرت الٰہیہ کو ایک دوسرے سے جدا کر کے سمجھنا مشکل ہے ۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ اس نظریئے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

" فطرت ، جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، محض مادے کا ڈھیر نہیں، کہ خلا میں پڑا ہو، بلکہ حوادث کی ایک ترکیب، ایک باقاعدہ طریقِ کار اور اس لئے "حقیقی" انا " سے نامی طور پر وابستہ ہے ۔ لہذا فطرت کو ذاتِ الٰہیہ سے وہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نسبت ہے جو سیرت اور کردار کو ذات انسانی سے" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

ہم کائنات اور خدا کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ قرآن پاک کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کو یکساں طور پر دعوت دیتی ہے کہ خدا کا عرفان حاصل کرنا چاہتے ہو تو کائنات کا مطالعہ کرو۔ اگر کائنات کو صحیح طریقے سے سمجھنے کی آرزو رکھتے ہو تو خدا پر ایمان لے آؤ۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ (سورۂ غاشیہ ۸۸ آیات ۱۷ تا ۲۰)

"کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کیسے پیدا کیا گیا ہے اور آسمانوں کو کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو کیسے جمایا گیا ہے اور زمین کیسے پھیلائی گئی ہے"۔

اپنے مذہب کی روشنی میں کائنات کا مشاہدہ قرآن مجید کی رُو سے ایک مسلمان پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز۔ کیونکہ وہ کائنات کو جتنا زیادہ سمجھے گا، خالق کی معرفت اسی قدر زیادہ ہوگی اور وہ یہ سمجھ سکے گا کہ اس کی پیدائش کی غرض و غایت کیا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (سورہ آل عمران ۳ آیات ۱۹۰-۱۹۱)

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش اور دن رات کی تبدیلی میں عقلمندوں کے لئے یقیناً نشانیاں ہیں۔ ان کے لئے جو اٹھتے بیٹھتے اور سوتے میں کروٹیں بدلتے وقت بھی اپنے رب کا ذکر کرتے ہیں اور زمین اور آسمان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! تو نے یہ کائنات بے فائدہ نہیں بنائی۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ اے اللہ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا"۔

قرآن پاک میں یہ بات بڑا زور دے کر کہی گئی ہے کہ اس کی تعلیمات کی، جو خدا کی محبت اور اس کی عبادت پر زور دیتی ہیں، افادیت اس وقت زیادہ روشن ہوگی جب مادّہ، زندگی اور روح کے متعلق انسانی علم میں اضافہ ہوگا۔

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۝ (سورہ حٰمٓ السجدہ - ۷)

"ہم جلد ہی انہیں خارجی دنیا (مادّے اور حیاتِ انسانی میں کارفرما قوانین فطرت) اور ان کی اپنی جانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ اس بات پر ایمان لے آئیں کہ قرآن بالکل برحق ہے۔"

قرآن مجید انسانوں کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنے کانوں، آنکھوں اور دماغوں کو صحیح طریقے سے استعمال نہ کیا تو وہ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ ہوں گے

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝

(سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹)

"یقیناً ہم نے جہنم کے لئے بہت سے ایسے جن اور انسان پیدا کئے ہیں جو دل رکھتے ہیں، لیکن غور نہیں کرتے، جو آنکھیں رکھتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں، جو کان رکھتے ہیں لیکن سنتے نہیں، جو چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ یہی لوگ غافل ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ علم کے معاملے میں مسلمانوں نے کبھی سیکولر رویّہ اختیار نہیں کیا۔ سائنسی مضامین پر قدیم مسلمان علما نے جو کتابیں لکھی ہیں، اُن کے آغاز، وسط اور آخر میں خدا کا ذکر بار بار کیا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصنف اپنے قارئین کے ذہن میں یہ بات بٹھانا چاہتا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی معرفت انسان کے لئے ضروری ہے۔ مسلمان دانشوروں نے وہ سائنسی طریقے ایجاد کئے جن کی بدولت وہ جدید سائنس کے امام اور بانی کہلائے۔ ان کی اس عظمت اور کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ علم کے بارے میں روحانی اندازِ فکر رکھتے تھے۔ قرآنِ پاک کی تعلیمات اُن کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ نیز اُن لوگوں میں کائنات کو سمجھنے کی بے پایاں خواہش پائی جاتی تھی۔ اسلام تاریخِ عالم کی وہ اوّلین تحریک تھی جس نے انسان کو کائنات کے باقاعدہ اور محتاط مطالعہ کی پرزور دعوت دی۔ مغربی سائنس اپنے عروج و ارتقاء کے لئے اسلام کی بہت زیادہ مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلے میں بریفالٹ کی کتاب "MAKING OF HUMANITY" کے مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

"راجر بیکن نے عربی زبان اور عربی میں سائنسی علوم کا مطالعہ آکسفورڈ سکول میں مسلمانوں کے جانشینوں کی نگرانی میں کیا۔ راجر بیکن یا اس کا کوئی ہمنام اس اعزاز کا مستحق نہیں کہ اسے سائنس کے تجرباتی طریقے کا بانی قرار دیا جا سکے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عیسائی یورپ میں وہ مسلمانوں کے ایجاد کردہ سائنسی علوم کا ادنیٰ خوشہ چیں تھا۔ اس نے اپنی اس حیثیت کا اعتراف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا وہ اپنے ہم عصر سائنسدانوں سے کہا کرتا تھا کہ صحیح علم تک پہنچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ عربی زبان اور عربوں کے ایجاد کردہ سائنسی علوم کا مطالعہ کرو۔ سائنس میں تجرباتی طریقے کا موجد کون تھا؟ یہ ایک متنازعہ سوال ہے اور یورپی تہذیب کے آغاز وارتقاء سے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیوں میں سے ایک ہے۔ تاہم اتنی حقیقت واضح ہے کہ عربوں کا تجرباتی طریقہ تدریس بیکن کے زمانے تک یورپ میں خاصا معروف و مقبول ہو چکا تھا۔" (صفحہ نمبر ۲۰۲)

"جدید دُنیا کی سائنسی ترقی میں عرب تہذیب کا زبردست حصہ ہے۔ لیکن عرب تہذیب کے یہ ثمرات بہت دیر بعد اس وقت یورپی تہذیب پر اثر انداز ہوئے جب ہسپانیہ میں مُوری تہذیب (مُور خاندان کا تمدن) بری طرح زوال پذیر ہو چکی تھی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں صرف سائنس کا ہاتھ نہیں بلکہ اسلامی ثقافت کے ان گوناگوں اثرات کا بھی اس میں زبردست حصہ ہے جو یورپ پر مرتب ہو چکے تھے۔" (صفحہ نمبر ۲۰۲)

"یورپ کے عروج وارتقا کا ایک بھی پہلو ایسا نہیں جس پر اسلامی تمدن کے اثرات کی گہری چھاپ نہ ہو، یورپ پر اسلامی تہذیب کے احسانات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جدید دنیا کی تخلیق کرنے والی قوت اور اس کی کامیابی کا بنیادی زینہ یعنی نیچرل سائنس اور سائنسی جذبہ بھی اسی کا مرہون منت ہے۔" (صفحہ نمبر ۱۰۹)

جدید سائنس کے انقلابی نظریات اور ان کے حیران کن انکشافات ہی عربوں کے منت کش نہیں، سائنس اس سے بھی زیادہ اسلامی تہذیب کی احسان مند ہے۔ حد یہ ہے کہ سائنس اپنی ابتدا کے علاوہ بقا کے لئے بھی عربوں کی رہینِ منّت ہے۔ ہم جس قدیم دنیا کو جانتے ہیں وہ سائنس کے نام سے بھی ناآشنا تھی۔ ہیئت اور ریاضی میں یونان کا شہرہ تھا لیکن اصل میں یہ دونوں علم بھی باہر سے درآمد کئے گئے تھے اور انہیں بھی یونانی تہذیب راس نہیں آئی۔"

"بلاشبہ یونانیوں نے سائنس کو باقاعدہ علم کی شکل میں مرتّب کیا، اسے ترقی دی، نئے نئے نظریات وضع کئے تاہم تحقیق و جستجو کے باضابطہ طریقے، مفید معلومات کی وسیع پیمانے پر فراہمی، سائنس میں باریک بینی کا اسلوب، طویل اور تفصیلی مشاہدہ اور تجرباتی طریقہ تحقیق ان کے لئے اجنبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیزیں تھیں۔ سکندر اعظم کے بعد اسکندریہ میں سائنس پر جو تحقیقی کام ہوا، اسے اس دور کا معیاری کام کہا جاتا ہے، لیکن ہماری موجودہ سائنس کی پیدائش اور ارتقار کا گہوارہ یونان نہیں یورپ ہے۔ سائنس کو یہ عروج تحقیق و تفتیش کے نئے جذبات، سعی و تجسّس کے نئے نئے طریقے، تجربے کے نوع بنوع انداز، مشاہدات کی وسعت اور حیرت انگیز انداز میں ریاضی کے ارتقاء کی بدولت نصیب ہوا ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ ان چیزوں سے یورپی دنیا کو روشناس کرانے والے عرب تھے نہ کہ یونانی۔" (ص ۱۹۰)

اس اعتراف واقبال کی روشنی میں دیکھئے تو عیسائی ارباب علم کے سیکولر اندازِ فکر پر رونا آتا ہے جو اپنے پیش روؤں ـــ مسلمانوں ـــ کے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور سائنس کی بعض نہایت اہم شاخوں کی ترقی اور فروغ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔

ذہن کی یہ کجی یا فکری لادینیت صرف عیسائیت کی مخصوص علمی فضا میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔ کیوں کہ عیسائیت کی تعلیمات بجائے خود اس کو شہ دیتی ہیں۔ عیسائیت کا بانی بادشاہ اور خدا کے حقوق کو ایک دوسرے سے الگ الگ قرار دیتا ہے۔ شاہی اور خدائی حقوق میں تفریق نے مادی اور روحانی دنیا میں ایک حدِ فاصل کھڑی کر دی۔ اس کے ایک طرف سراسر دین سے خالی، مادی اغراض کی غلام اور عارضی دنیا ہے۔ اور دوسری جانب ملکوتی، روحانی اور دینی عالم ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف بلکہ متضاد ہیں۔ عیسائیت کا کوئی پیرو کار بیک وقت ان دونوں سے متمتع نہیں ہو سکتا۔ اگر اُسے عالمِ آخرت کی کامرانی اور راحتیں مطلوب ہیں تو اس دنیا کے عیش و آرام سے کنارہ کش ہونا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ مادی دنیا کے لذائذ سے فیضیاب ہونا چاہتا ہے تو آخرت میں کامیابی کی اُمید نہ رکھے۔ گویا عیسائیت میں مادہ اور روح کے درمیان کوئی قدرِ مشترک نہیں۔ اسی طرح عیسائیوں نے جن سائنسی علوم کو فروغ دیا ہے، اُن میں اور مذہب میں معمولی سا رشتہ بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مادی زندگی میں مذہب کی کوئی ضرورت نہیں، یہ صرف آخرت میں کام آنے والی چیز ہے۔ جب کہ اس دنیا میں فلاح و کامرانی کے لئے مادی سائنس ہی کافی ہے۔ لیکن (اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق) مذہب ایمان بالغیب کا نام ہے اور کسی دلیل کے بغیر اللہ تعالیٰ کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس میں اعتقادی عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس کا تعلق ایسی دنیا سے ہے۔ جسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔ اس کے برعکس سائنس اُن نتائج کو تسلیم ہی نہیں کرتی جن کی بنیاد کسی دلیل، عقل و فہم، مشاہدے اور تجربے پر نہ ہو۔ اس لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک عیسائی کے لئے یہ فطری امر ہے کہ وہ خدا پر اس طرح ایمان لا سکتا ہے کہ عقلی دلائل اس کے منطقی کردار کو ختم کر دیں۔ اگر اسے مذہبی امور پر غور و خوض کرنا پڑے تو دلیل کے مقابلے میں بلکہ اس کے خلاف اپنے میلانِ طبع، تعصب اور غیر منطقی ہتھکنڈوں سے کام لے۔ خود فیصلہ کیجئے کہ سائنسی علوم کے متعلق مذکورہ بالا اسلامی اندازِ فکر اور عیسائیوں کے نقطہ نظر میں کتنا اختلاف اور بُعد ہے۔

مغرب کے عیسائیوں میں یہ فکری لادینیت یا ذاتِ حق کے تصور کے خلاف تعصب، جسے انہوں نے بطور نظریۂ حیات اپنا لیا ہے، ان کے مذہب کا پیدا کردہ ہے۔ بعد میں جب چرچ نے ذہنی آزادیوں پر پابندی لگانے کی کوشش کی اور مذہبی عدالتوں نے عیسائیت کے منکروں پر ظلم ڈھائے تو مذہب اور ریاست کے مابین شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ ردِ عمل کے طور پر یورپ میں ایک زبردست تحریک اٹھی جس نے مذہب اور حکومت میں دائمی جدائی ڈال دی اور لادین نظریات کو تقویت بخشی۔ اس طرح یہ ذہنی سیکولرازم کا پودا تناور درخت بن گیا۔ ظاہر ہے کہ مذہب کو سیاست سے لاتعلق کر دینے کے بعد اس سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ فرد یا معاشرے کی زندگی کے کسی اہم پہلو پر اپنی گرفت مضبوطی سے قائم رکھ سکے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرد اور معاشرے کی نہ صرف سیاسی سرگرمیوں سے دین کا رشتہ ختم ہو گیا بلکہ اس کی قانونی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور ذہنی سرگرمیاں بھی مذہب سے آزاد ہو گئیں۔ اس نظریہ کو مضبوط بنانے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ انیسویں صدی کے ان ماہرین طبیعیات نے پوری کر دی جو اس عقیدے کے داعی تھے کہ مادّہ حقیقی ہے، اُسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، تجربہ گاہوں میں اس پر تجربے کر سکتے ہیں۔ لیکن رُوح اور خُدا غیر حقیقی ہیں، کیونکہ نہ وہ ہمیں نظر آتے ہیں نہ اُن پر تجربات کئے جا سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ بات عمومی طور پر تسلیم کر لی گئی کہ مذہب کو سائنس سے الگ رکھا جائے۔ یہ کائنات ایک مشین کی مانند ہے اور اپنے اصولوں کیمطابق خود بخود متحرک ہے۔ اسے حرکت میں لانے کے لئے کسی خارجی قوت کی ضرورت نہیں۔ یہ تعصب بڑھتے بڑھتے ایک فطری فطرتیے میں تبدیل ہو گیا اور ڈارون کی انقلابی تشریحات نے اسے سائنسی نظریہ بنا دیا۔ ڈارون بذاتِ خود انیسویں صدی کے جامد مادّی اور میکانکی نظام کی پیداوار تھا۔ اس نے تخلیقِ کائنات کے بارے میں ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا۔ جس میں انسان کی پیدائش فطرت کی اندھی قوتوں کے اتفاقیہ تصادم کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس تصادم کو وہ بقا کی جنگ، فطرت کے انتخاب اور بقائے اصلاح ——— (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈارون کا خیال ہے کہ انسان میں فہم و ادراک، قوتِ استدلال، ضمیر اور قوتِ متخیلہ جیسی چیزیں محض حادثاتی طور پر پیدا ہوتی ہیں۔ ان صفات کی بدولت وہ مذہب اخلاق، سیاست، تعلیم، قانون، فن سائنس اور فلسفہ میں دلچسپی لینے لگا۔ اگر فطری قوتوں کے تصادم کا چکر اُلٹ جاتا تو عین ممکن تھا کہ حضرتِ انسان منحوس جانور یا کیڑا بن جاتا۔ اس نظریے کی بنیاد مذہب سے نفرت پر رکھی گئی تھی۔ اس لئے مذہب سے بیزار یورپ نے اسے فوراً قبولِ عام کی سند دے دی۔ دانشور طبقوں اور علمی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا سائنسدانوں نے اسے سینے سے لگالیا۔ اس نظریے نے جملہ سائنسی علوم کی ترقی پر گہرا اثر ڈالا۔ بہت سے نئے نئے اصول اس کی روشنی میں قائم کئے گئے۔ جن میں ایک یہ تھا کہ کائنات کی ہر چیز اور ہر وجود ارتقائی عمل کی اتفاقی پیداوار ہے اور اس کے قریبی ماضی کے حوالے سے، جس نے اسے وجود بخشا، اس چیز کی کیفیت تفصیل کے ساتھ بیان کی جاسکتی ہے۔ نہ صرف مادّہ اور حیوانی زندگی کو سمجھنے کے لئے اس اصول سے مدد لی جاتی ہے بلکہ انسانی شعور و ادراک کو بھی اسی کے حوالے سے سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ انسانی شعور کو مادّہ ہی کی ایک ترقی یافتہ صفت قرار دیا جاتا ہے۔ مادّے کا کوئی ماضی ہمارے علم میں نہیں، اس لئے اسے آپ اپنی شرح کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس صداقت کو قبول کریں کہ خدا کا وجود ایک حقیقت ہے اور اپنی فطری ساخت کے لحاظ سے انسانی وجود کا ذاتِ الٰہی سے گہرا تعلق ہے بلکہ اس کی بقا کا انحصار بھی اسی پر ہے تو پھر ہم ایسے نظریہ کو کیسے تسلیم کرسکتے ہیں جس میں سرے سے خدا کے تصوّر کی گنجائش ہی نہ ہو۔

وجودِ باری کے تصوّر کے خلاف مغربی فلاسفروں میں یہ تعصّب اتنی شدّت اختیار کرگیا ہے کہ انہوں نے انسانی فطرت کے مطالعہ کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ حالانکہ وہ اس کی اہمیت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے چشم پوشی کے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں محض اس لئے کہ سائنٹیفک انداز میں انسانی فطرت کو سمجھنے کی واحد صورت خدا کا تصوّر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کو سمجھنے کے لئے اپنے سیکولر نظریات سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کا ذہن فطرتِ انسانی کے متعلق کسی ایسے نظریہ کا تصوّر کرنے سے عاری ہے جو بیک وقت مذہبی اور روحانی بھی ہو اور سائنسی بھی۔ وہ فطرتِ انسانی سے اپنی لاتعلقی کا اعتراف کرتے ہیں تو ساتھ ہی اس کی یہ توجیح پیش کرتے ہیں کہ انسانی جبلّت کے بارے میں جو بھی نظریہ بنایا جائے، وہ لازماً سیکولر اور غیر روحانی ہونا چاہیئے۔ لیکن ان کی یہ خواہش ہرگز پوری نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ انسان میں خُدا کی صفات کا پرتو موجود ہے۔ جب تک خدا کے وجود کا انکار نہ کیا جائے، انسان کو علم یا سائنس کے دائرے سے خارج کرنا ممکن نہیں۔ البتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سائنس کو غیر سائنس اور علم کو جہالت میں تبدیل کر کے ایسا کیا جا سکتا ہے۔

فطرت انسانی سے متعلق کسی سائنسی نظریے کو محض اس بنا پر قبول نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی تجربہ گاہ میں کئے گئے چند تجربات کے نتائج پر مبنی ہے۔ فطرتِ انسانی کا علم تاریخ انسانیت کے ان تمام قدیم و جدید مسلمہ حقائق پر محیط ہے جو انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں سے ماخوذ ہیں۔ اگر ہم کوئی ایسا مفروضہ سوچ سکیں جو ان تمام حقائق کو بیان کر سکے یا انہیں مربوط اور باضابطہ انداز میں مرتّب کر سکے تو یہ مفروضہ سائنس کی مسلمہ صداقت بن جائے گا اور بہت سی صداقتوں سے مرتب ہونے والا نظریہ فطرتِ انسانی کا سائنسی نظریہ کہلاتا ہے۔

انسان فطرتاً مذہبی اور فطری مظاہر کو دیکھتے ہوئے خدا کا پرستار ہے۔ یہ ایک معروف سائنسی سچائی ہے۔ اگر اس سچائی کو مذہبی نقطہ نظر سے بیان کیا جائے تو وہ انسانی فطرت کے سائنسی نظریہ کا ایک جزو بن جائے گی۔

خدا کے وجود سے محض اس بناء پر انکار کرنا کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، درست نہیں۔ کیونکہ کسی چیز یا وجود کی ذات کو سائنسی طریقے سے ثابت کرنے کے لئے اس کا نظر آنا ضروری نہیں۔ اگر ہمیں سائنسی طریقے سے کسی جگہ دھوئیں کی موجودگی کا یقین ہو جائے تو ہم یہ مان لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ وہاں آگ یا جلنے والی کوئی اور شے موجود ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کسی غیر مرئی چیز کی ظاہری علامات اور اثرات سے نہ صرف اس کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کی خاصیتیں اور خوبیاں بھی بیان کی جا سکتی ہیں۔ ایٹم ایک سائنسی صداقت ہے۔ لیکن کیا آج تک کسی سائنسدان نے اسے دیکھا ہے؟

سائنسدانوں کے نزدیک سائنسی صداقتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو براہ راست ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں اور دوسری وہ جو مفروضات کی شکل میں ہوتی ہیں اور ایسے حقائق کی وضاحت کرتی ہیں جن کی بنیاد بالواسطہ مشاہدے پر ہو۔ ایٹم دوسری قسم کی سائنسی حقیقت ہے، اسی طرح خُدا کا وجود بھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قوتِ تخلیق کے ساتھ، جسے مغرب کے بعض سائنسدانوں نے اپنی سہل پسندی یا جہالت سے زندگی کو نمو بخشنے والی قوت سمجھا ہے، انسان میں پائی جانے والی صفات ارادہ اور شعور وابستہ ہیں۔ اس مفروضے کی بنیاد پر طبیعیات حیوانیات اور نفسیات کی سچائیوں کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے نے سائنسی حقیقتیں معلوم کرنے کے لئے اپنے دوست چارلس کنگسلی کو ذیل کا دل کش طریقہ تجویز کر کے بھیجا تھا۔

"سائنس کی حقیقتوں کے روبرو بچّے کی طرح (انجان بن کر) بیٹھ جاؤ۔ جتنے بھی ذہن میں تصورات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور خیالات ہوں، انہیں یک قلم بھلا دو، فطرت جس جس سمت رہنمائی کرے، نیاز مندی سے اس کے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ، ورنہ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

ہکسلے کے اس قول میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں۔ مغربی اربابِ دانش فطرت کو سمجھنے میں اسی واسطے ناکام رہے کہ انہوں نے سائنسی صداقت کے سامنے بچے کی مانند زانوئے تلمذ تہ کرنے اور اپنے ذہنوں پر پہلے سے نقش شدہ اس باطل نظریہ کو بھلانے کی کوشش نہیں کی کہ سائنسی طریقے سے خدا کی پہچان ممکن نہیں۔ انہوں نے نیاز مندی کے ساتھ انسان اور کائنات کے بارے میں روحانیت کی پیش کردہ وضاحت کو قبول نہیں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مطالعہ کائنات میں وہ کورے کے کورے رہ گئے اور اب تو اس میدان میں ان کی جدوجہد صفر رہ گئی ہے۔

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء چونکہ ان کے ذہنی رجحان سے مطابقت رکھتا ہے، اس لئے اس کو انہوں نے حرزِ جاں بنا لیا اور اس عقیدے پر ایمان لے آئے کہ ارتقائی نتائج کی ترتیب میں جو چیز سب سے پہلے آتی ہے وہ مادّہ اور اس کے اصول ہیں۔ اس کے بعد حیوان اور حیوانی جبلتیں اور سب سے آخر میں انسان کا نمبر آتا ہے جسے خود آگاہی اور مقاصدِ حیات سے محبت کرنے کی صلاحیت بخشی گئی ہے۔ حیوان اصل میں مادّے سے نکلا ہے اور ارتقاء کی بدولت اس میں زندگی پائی جاتی ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان کی کسی نظریے کے ساتھ وابستگی چونکہ حیوانی جبلت کی بنا پر ہوتی ہے اس لئے خود انسان بھی ایک یا کئی حیوانی جبلتوں کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان، حیوان سے بنا ہے اور حیوان مادّہ ہے۔ اس لئے انسان کی حقیقت مادّہ کے سوا کچھ نہیں۔

چنانچہ مشہور ماہرِ نفسیات فرائڈ کسی مقصد کیلئے انسان میں پائی جانے والی خواہش کو کسی جنسی جبلت کی بگڑی ہوئی یا ترقی یافتہ شکل قرار دیتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مذہب، اخلاق، آرٹ، سائنس، فلسفہ اور سیاسیات میں اس کی سرگرمیاں جاری رہیں اور جنسی خواہش کی راہ میں مزاحم ہونے والی رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ ایڈلر کا خیال ہے کہ انسان میں کسی نظریے کے لئے جو لگن پائی جاتی ہے وہ اس کے جذبۂ خودنمائی کی بدلی ہوئی اور ترقی یافتہ صورت ہے۔ انسان کا یہ جذبہ میکانکی ارتقاء کے ہر زمانے میں کارفرما رہا ہے۔ تاکہ دوسرے جارحیت پسند اور دشمن جانوروں کے مقابلے میں حیوانی زندگی کی حفاظت کی جا سکے۔ جب کوئی فرد حصولِ اقتدار کے معاملے میں اپنی کسی خواہش کی [illegible] نہیں ہو سکتا تو اس کے اندر [illegible] سے [illegible] چلتے کسی اور مقصد کی تڑپ جنم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لے لیتی ہے اور وہ احساسِ کمتری کی تلافی کے لئے اس کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے۔ کارل مارکس کی رائے میں نظریات سے یہ لگاؤ اس کی معاشی خواہش کی غیر شعوری طور پر بدلی ہوئی صورت ہے۔ بظاہر آدمی کسی نصب العین کے لئے تگ و دو کرتا ہے۔ لیکن اصل میں اس کے محرک وہ معاشی حالات ہوتے ہیں جنہیں وہ بہتر بنانا چاہتا ہے۔ میک ڈوگل اس تڑپ کو جذبۂ خود بینی کا اظہار قرار دیتا ہے۔ انسانی فطرت میں مختلف نظریات کیوں مقبول ہوتے ہیں۔ اس کی مذکورہ بالا ساری وضاحتیں منطقی لحاظ سے ناقص بے ربط اور غیر تسلی بخش ہیں۔ مثلاً فرائڈ کے خیال میں انسان کا آدرش جنسی خواہش کے نتیجہ میں جنم لیتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ بعض انسان جنس کو زندگی سے بالکل خارج کر دینے کے باوجود نظریات سے کیوں محبّت کرتے ہیں۔

اسی طرح ایڈلر یہ بتانے سے قاصر ہے کہ انسان کا جذبۂ خود نمائی، جس کا بنیادی مقصد جان کی حفاظت کرنا ہے، ایسے آدرش کو کیوں ظہور بخشتا ہے، جس کی خاطر انسان جان کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے یہی حال کارل مارکس کا ہے۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ بقول اس کے، انسان کی ساری جدوجہد کا مقصد معاشی حالت کو سدھارنا ہے، جو زندگی کو باقی رکھنے کا ایک ذریعہ ہے، تو پھر وہی انسان اپنے نصب العین کی طلب پر جان دینے کے لئے کیوں آمادہ ہو جاتا ہے۔ مقاصد کے متعلق مغربی مصنفین کے پیش کردہ ان نظریات کا تجزیہ کیا جائے تو اس قسم کے سوالات کا جواب دینا محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسے سوالوں کو چھیڑا تک نہیں۔ ان کی ذہنی حالت اس لال بجھکڑ سے مختلف نہیں جو یہ نہ جانتا ہو کہ درخت کیسے اگتا ہے۔ اس کے باوجود لوگوں کو درخت کی ارتقائی تاریخ بتانے لگے اور ہمہ دانی کے زعم میں یہ کہنے لگے کہ درخت کی نشوونما میں سب سے پہلے تنا آتا ہے۔ پھر شاخیں، پتّے اور سب سے آخر میں بیج لگتا ہے جو پھول میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ درخت کی اصل بنیاد — بیج — کو محض اس لئے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ زمین میں چھپا ہوتا ہے اور اُسے نظر نہیں آتا۔ زمین سے نکلتے ہوئے تنے کو اس کی نگاہیں دیکھ لیتی ہیں۔ اس لئے اسی کو درخت کی اصل سمجھ بیٹھتا ہے جیسے یہ احمق اپنی جہالت کے باعث بیج کے بجائے تنے کو درخت کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ بعینہٖ مغرب کے نام نہاد دانشور جہالت کی وجہ سے انسان کی اصل بنیاد — خود آگاہی — کو نہ سمجھ پائے اور انہوں نے فیصلہ دے دیا کہ انسان مادّہ سے بنا ہے۔

ان کے اس لادین تصوّرِ حیات نے انہیں اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ وہ سرے سے اس امکان کو قبول نہیں کرتے کہ خود آگاہی کا جوہر، جو انسان میں کائنات کے انتہائی نقطۂ ارتقاء پر پیدا ہوتا ہے اور جس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بدولت انسان مقاصد سے پیار کرتا ہے، وہ اپنے خالق کے روپ میں تخلیق کائنات کی بنیاد اور سرچشمہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح بیج درخت کی نشوونما کے سب سے آخری مرحلے میں نمودار ہوتا، لیکن درخت کا نقطۂ آغاز یا اصل بھی وہی ہوتا ہے۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ انسانی فطرت میں مکان کے تصور یا انسانی فطرت اور اس کی سرگرمیوں سے متعلق کسی بھی نظریے کا کردار اتنا اطمینان بخش اور تاثر انگیز نہیں جتنا کہ یہ نظریہ جو کہتا ہے کہ "فطرتِ انسانی میں پائی جانے والی مقاصد کی لگن نہ تو ان جبلتوں سے ماخوذ ہے نہ ہی ان کے تابع جو ارتقا کے ابتدائی مراحل میں انسان اور حیوان کے اندر مشترک پائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ انسانی کردار کی تکمیل اور حسن کے لئے پائی جانے والی ایسی خواہش ہے جو مذکورہ تمام جبلتوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ خواہ حیاتیاتی لحاظ سے وہ کتنی ہی زوردار اور سرکش کیوں نہ ہوں۔"

یہ نظریہ انسان کی فطرت اور تاریخ کے ان تمام معروف و مسلمہ حقائق کو بڑی خوبصورتی سے بیان کر سکتا ہے اور انہیں ایک مربوط انداز میں ترتیب دے سکتا ہے، جو نفس کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ شائد کوئی دوسرا نظریہ اتنی خوبی سے ان حقائق کی تشریح نہ کر سکے۔ اس نظریئے کی یہ خصوصیت اس قابل ہے کہ سائنسی حقائق کا جائزہ لینے کے لئے ہم اس کو کسوٹی کے طور پر قبول کر لیں۔ لیکن ایک سیکولر دانشور اس نظریے کی جس بھونڈے انداز میں نئی نئی تشریحات پیش کرے گا، ان کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہ نظریہ اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ نصب العین کے لئے انسان میں جو تڑپ پائی جاتی ہے وہ حقیقی ہے انسان کی جملہ سرگرمیوں کی، خواہ وہ معاشی، سیاسی، اخلاقی، قانونی، علمی اور فنی ہوں یا کسی اور نوعیت کی، قوتِ محرکہ یہی خواہش ہے۔ بلکہ یہ بجائے خود زندگی ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔ ؏

جس میں نہ ہو کشمکش، موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

یہ کسی جبلت کی پیداوار یا اُس کے تابع نہیں۔ تمام جبلتوں کی خالق اور ان کی نگران ہے۔ ارتقائی ادوار میں جبلتوں کو اس نے خود اپنی خدمت کے لئے جنم دیا تھا۔ یہ خود خالق کی قوتِ ارادی ہے جو انسان میں اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ ماضی میں حیاتِ انسانی نے ارتقاء کی جو منزلیں طے کی ہیں، وہ سب اسی کا صدقہ ہے۔ انسان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے مادہ اور حیوان جن ارتقائی مراحل سے گزرے، ان میں بھی یہی کارفرما تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج بھی انسان کی معاشرتی اور نفسیاتی ترقی کی بنیاد یہی ہے۔ مادی ارتقاء کے زمانہ میں یہ برقی قوت کے روپ میں ظاہر ہوئی اور مادی مخلوق کو مختلف ارتقائی مرحلے طے کرنے میں مدد دی۔ یہاں تک کہ کائنات انسانی زندگی کے ظہور کے قابل ہوگئی۔ حیات کے ارتقائی دور میں یہ زندگی بخش قوت ثابت ہوئی اور اسی کی بدولت زندگی ترقی کرتی ہوئی حیوانیت سے انسانیت میں داخل ہوئی۔ انسانی زندگی کے نقطۂ آغاز پر اس نے انسان میں مقصد کی تڑپ پیدا کی اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس تڑپ کا منتہائے مطلوب انسان کو معاشرتی اور شعوری ارتقاء کے نقطۂ عروج پر پہنچانا ہے۔

پھر یہ بھی امر مسلّمہ ہے کہ انسان کو کسی آدرش یا نصب العین کو جوش وخروش کے ساتھ پیار کرنے سے جو مسرت اور لطف حاصل ہوتا ہے، وہ کسی خواہش کی تکمیل یا جبلت کی پیروی سے ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مقصد کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے انسان جان تک دینے سے گریز نہیں کرتا۔ جبلت کے پیچھے اتنا بڑا قدم شاذ ہی کوئی اٹھا سکتا ہے۔ کیونکہ جبلتیں بجائے خود زندگی نہیں، زندگی کی بقا کا ایک ذریعہ ہیں۔ مقاصد کیلئے یہ خواہش صرف اس صورت میں مطمئن ہوسکتی ہے کہ نظریہ ہر لحاظ سے اعلیٰ، اکمل اور احسن ہو۔ جس میں حسُن، خیر، صداقت اور قوتِ تخلیق کی وہ جملہ خوبیاں موجود ہوں، جو انسان اپنے خالق سے منسوب کرتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے تعلیمی ماحول یا کسی اور مجبوری کے باعث اپنی فطرت کے اس سچے نظریے کو نہیں اپنا سکتا تو لازماً اسے کوئی دوسرا نظریہ پسند کرنا پڑے گا۔ خواہ اس میں کتنی ہی برائیاں اور خامیاں ہوں۔ غلط قوتِ فیصلہ کی موجودگی میں وہ انہیں نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نظریے سے بہت سی خوبیاں وابستہ کرنی پڑتی ہیں۔ خواہ اس میں سرے سے اُن کا وجود ہی نہ ہو۔

چونکہ ایک نظریہ، خواہ صحیح ہو یا غلط، انسان کی جملہ سرگرمیوں کو مہمیز کرتا ہے۔ اس لئے انسان کے تمام تجربات خواہ وہ علمی، جمالیاتی اور اخلاقی ہوں یا روحانی، کسی نہ کسی نظریے کی روشنی میں انجام پاتے ہیں۔ مقصد کی لگن ان تجربات کو مربوط ومتحد کرتی ہے۔ ظاہر ہے اگر انسان کا مطمح نظر ایک صحیح اور مکمل نظریہ ــــ ذاتِ حق کا تصور ہو تو اس صورت میں اس کے تمام سچے تجربات اس نظریے کے مطابق ہوں گے، ان میں سرِ مو اختلاف یا تفریق نہ ہوگی۔ لیکن اگر نصب العین غلط اور نامکمل ہو تو سارے تجربات غیر متعلق نظر آئیں گے۔ وہ نظریہ کے مطابق ان میں ردّوبدل کرنے پر مجبور ہوگا۔ گویا غلط نظریہ اپنانے سے نہ صرف انسان کا اخلاق غلط ہوسکتا ہے بلکہ اس کا سائنسی علم بھی صحیح معنوں میں علم کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو شخص سائنسی علوم کے بارے میں سیکولر انداز سے سوچتا ہے۔ سمجھ لو کہ وہ سائنس کو صحیح نظریہ کے مطابق مربوط و مرتّب کرنے کا خواہش مند نہیں۔ چونکہ نظریاتی لحاظ سے کوئی بھی فرد غیر جانبدار نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر وہ صحیح نظریے کو پسند نہیں کرتا تو اسے کسی نہ کسی غلط نظریے سے پیار ہوگا اور اس شکل میں اس کے علم کا متاثر ہونا ایک فطری بات ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیکولر اندازِ فکر انسان کو غلط نظریات کی طرف لے جاتا ہے اور اس صورت میں اس کا علم ــــ اس کا تعلق فطرتِ انسانی سے ہو یا مادّہ اور حیاتِ حیوانی سے، ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ مختلف علوم سائنس کے متعلق غلط فہمی کی نوعیت مختلف ہوگی۔ کیونکہ سیکولر دانشور ایک ایسے جھوٹے خدا کا قائل ہوتا ہے جس کا وجود سائنسی تجربات و مشاہدات سے ثابت ہو، بدقسمتی سے اس غلط فہمی کی سنگینی کو پورے طور پر محسوس نہیں کیا جاتا کہ علم کے بارے میں سیکولر اندازِ فکر رکھنا اس سے کہیں زیادہ نقصان دہ اور خطرناک ہے کہ انسان خُدا کے وجود کا انکار کر دے یا کہنے لگے کہ خدا تو موجود ہے لیکن سائنسی علم اس کے وجود سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ اس صورت میں خُدا کے وجود کی گنجائش تو ہے اگرچہ سائنس سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ البتہ مثبت انداز سے سوچا جائے تو یہ رجحان کسی جھوٹے خدا ــــ مادّہ ــــ میکانکی قوّت یا خدا کا قائم مقام کسی اور دیوتا ــــ کو ماننے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اس سیکولر اندازِ فکر کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ یہ عمرانی اور معاشرتی علوم کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حیاتیاتی علوم کے لئے نسبتاً کمتر اور مادّی علوم کے لئے بظاہر بالکل بے ضرر ہے۔ گویا کوئی سائنسی علم جوں جوں تحقیق و جستجو اور شعور و ادراک کے دائرے سے دُور ہوتا جاتا ہے، سیکولر اندازِ فکر کی ضرر رسانی اسی نسبت سے گھٹتی جاتی ہے۔

وجہ ظاہر ہے کسی سائنسدان کا مقصدِ حیات خواہ غلط اور نامکمل ہی کیوں نہ ہو، اُس کے نزدیک ضمیر کی آواز اور شعور کی پکار کے مترادف ہوتا ہے۔ وہ اپنے نظریے کو ہی انسان اور پوری کائنات کا مقصدِ تخلیق سمجھ لیتا ہے۔ یہ غلط نظریہ قدم بہ قدم اس کے علم، تحقیق و جستجو اور تجربات و مشاہدات کو متاثر کرتا ہے۔ اس کا اثر اس وقت سب سے زیادہ ہوتا ہے، جب سائنسدان کی تحقیق کا مرکز عالمِ انسانیت ہو، کیونکہ یہی وہ عالم ہے جس کی براہ راست تمام نظریات پر حکمرانی ہے۔ جس میں اس کا اپنا نظریہ بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ سائنس دان انسان کی سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، فکری، تعلیمی، قانونی، فنّی اور معاشی سرگرمیوں کی اس انداز میں تشریح کرتا ہے کہ اس کا ذاتی نقطۂ نظر بالکل درست اور ہر قسم کی خامیوں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاک نظر آئے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ انسان میں نظریات کے لئے جو تڑپ پائی جاتی ہے، وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا منتہائے مقصود ایک مکمل مقصدِ حیات یعنی ذاتِ الٰہی کا تصور ـ تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ اس لئے سیاسیات، اخلاقیات، تعلیم، فن، قانون، تاریخ، معاشیات اور نفسیات میں سے کسی کو بھی اُسوقت تک باقاعدہ اور دانشمندانہ طریق سے منظم نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک ذاتِ الٰہی کے تصور کو اس کا بنیادی نکتہ اور اس کی روح نہ بنایا جائے۔ مغربی دانشوروں نے ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اس لئے یہ تمام علوم بحران سے دوچار ہیں اور ان کے فروغ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں سائنسدان کا غلط نقطۂ نظر اس کے اخذ کردہ نتائج اور تحقیق و جستجو پر اس وقت نسبتاً کم اثر انداز ہوتا ہے جبکہ وہ عالمِ حیوانات سے تعلق رکھتے ہوں۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ خارجی دنیا ہے۔ وہ اپنی بے خبری کے باعث اللہ تعالیٰ کے ارادۂ تخلیق کو زندگی بخشنے والی قوت کے روپ میں نہیں دیکھ سکتا، نہ ہی زندگی کی حقیقت، طریقِ کار اور ارتقائی عمل کی وضاحت کر سکتا ہے۔ کیونکہ نظریات کے لئے انسان میں جو لگن پائی جاتی ہے، اسے مغربی دانشور نہیں سمجھ پائے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں وہاں حیاتیاتی علوم نے جو تھوڑی بہت ترقی کی تھی اب وہ بھی رک گئی ہے۔

اگر ایک ماہرِ طبیعیات غلط مقصد کو منتخب کر لے تو اس کا اثر سب سے زیادہ وہاں پڑتا ہے جہاں فزکس فلسفہ کی حدود میں داخل ہوتی ہے۔ تاکہ ان تحقیقات سے اپنے مقصد کے مطابق نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ کیونکہ ماہرِ طبیعیات کے علم کو اس کے مقصد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر آدمی ایک صداقت کو اپنے نظریہ کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اس کا علم و عرفان سراسر اُسکے نظریے کے تابع ہوتا ہے۔ دو مختلف نظریات سے محبت کرنے والے افراد کی نظر میں ایک صداقت یکساں نہیں ہوتی۔ وہ تو مادی مخلوق کو بھی مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ "دو جمع دو برابر ہے چار" جیسی سادہ سچائی بھی ان کے نزدیک یکساں اہمیت نہیں رکھتی۔ اس سلسلے میں اس بھوکے کی مثال قابلِ ذکر ہے جس سے کسی نے پوچھا تھا کہ "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟" تو اس نے جواب میں کہا تھا "چار روٹیاں"۔

یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ انسان اپنے اغراض و مقاصد کے لئے مسلّمہ سچائیوں کو بھی کس طرح بدل دیتا ہے علم محض کسی چیز کے بارے خارجی معلومات کے ڈھیر کا نام نہیں، بلکہ اس میں ہمارے داخلی رجحان اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے استفادہ کرنے کے لئے ہمارے مقاصد کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معلومات کا ذخیرہ اور اُن سے متعلق رجحان مل کر علم کی تشکیل کرتے ہیں۔ علم سے ذہنی تجربہ جنم لیتا ہے۔ اس لئے اگر نظریات میں اختلاف ہو تو علم خواہ وہ فزکس اور ریاضی کا ہی کیوں نہ ہو، ہرگز یکساں نہیں ہو سکتا۔ بے شک ظاہر میں وہ ایسا نظر آتا ہو۔ مثال کے طور پر ایک ایسے کمرے میں سفید قالین بچھا دیا جائے جس میں مختلف رنگوں کے بلب لگے ہوں۔ تو آپ سرخ، نیلا، سبز، غرض جس رنگ کا بلب جلائیں گے، قالین اسی رنگ کا نظر آئے گا بچھانے والے کی نظر میں وہ سفید ہے لیکن بعد میں آنے والے اسے جس رنگ میں دیکھیں گے، ان کی رائے میں اس کی وہی رنگت ہوگی۔ گویا ایک ہی سچائی کو دو مختلف نگاہوں سے دیکھا جائے تو اس کی حقیقت مختلف ہو جاتی ہے چنانچہ جرمنی کے نازیوں کا یہ قول بالکل درست تھا کہ ان کی سائنس باقی دنیا کی سائنس سے یکسر الگ ہے۔ اسی طرح آج روسی یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی سائنس یہاں تک کہ طبیعیات اور ریاضی بھی، سرمایہ داروں کی سائنس سے مختلف ہے۔

خلاصہ یہ کہ سچّے اور فطرتِ انسانی کی وضاحت کرنے والے نظریات، جو ناقابلِ مزاحمت انداز میں خُدا کے تصوّر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، سیکولر اندازِ فکر کے باعث مغربی دانشوروں کے نزدیک کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ اس تعصب میں ان کے کٹر پن کا یہ عالم ہے کہ مطالعۂ فطرت کے دوران جہاں انہیں ذاتِ حق کا تصوّر محسوس ہونے لگے وہ فوراً بدک جاتے ہیں۔ وہاں خدا کے بجائے کوئی اور اصطلاح گھڑتے ہیں اور اس سمت میں آگے بڑھنا بند کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے دُنیا نے سائنسی میدان میں ان کو امام تسلیم کر لیا ہے اس لئے ان کا یہ تعصب عقل و استدلال کے نام سے روئے زمین پر پھیل گیا ہے اور اس کے ہولناک نتائج دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ آئندہ اس سے بھی بدتر نتائج نکلنے کا اندیشہ ہے۔ معاشرتی علوم کی ترقی کا راستہ مسدود ہو چکا ہے۔ وہ انتشار کی حالت میں ہیں۔ حیاتیاتی علوم کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں۔ حیاتِ انسانی کے ارتقاء کے نظریہ کو صحیح انداز میں اپنایا جاتا تو وہ انسانیت کے لئے تابناک مستقبل کا ضامن ثابت ہوتا۔ لیکن افسوس اسے غلط انداز میں سمجھا گیا اور آج بھی با اثر ماہرینِ حیات کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جو ہر قیمت پر اپنے سیکولر اندازِ فکر کو قائم رکھنے پر مُصر ہیں اور اس نظریہ کو اس کی تمام تر خامیوں کے باوجود جوں کا توں برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگر مغرب کے یہ اربابِ علم و دانش، خدا سے بیزاری کے مرض میں مبتلا نہ ہوتے اور ان میں اتنی جرأت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتی کہ اپنے ہی ایک ساتھی ہکسلے کی یہ نصیحت مان لیتے "فطرت کی پیروی کرو خواہ وہ کسی طرف اور کتنی ہی گہرائی میں لے جائے" تو وہ علم کی اس منزل سے بآسانی گزر جاتے، جہاں آکر معاشرتی علوم کی ترقی بند ہوگئی ہے۔ اگر وہ نظریات کے لئے پائی جانے والی خواہش کے اس صحیح نظریہ کو قبول کر لیتے جو عقلیت کے معیار پر پورا اترتا ہے، تو حیاتیاتی اور مادی علوم سے سیکولرازم غائب ہو جاتا۔ کیونکہ انسان کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل کرنے سے پوری کائنات کے متعلق نظریہ خود بخود بدل جاتا ہے۔ انسان کے متعلق دینی یا روحانی تصوّر سیکولر نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ اور دونوں میں کہیں بھی کوئی قدرِ مشترک نہیں پائی جاتی۔

دُنیا کے بعض مشہور ماہرین طبیعیات گو اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں کہ برقی قوّت، جس کے سہارے عالم مادّیت پروان چڑھا، ضمیر ہی کی ایک قوت ہے جو حسابی ذہن رکھتی ہے۔ لیکن اس بات کو ماننے سے انکاری ہیں کہ ضمیر کی یہ قوت اللہ تعالیٰ کا ارادۂ تخلیق ہے۔ اسی طرح بعض معروف ماہرین حیاتیات اس نتیجے تک پہنچ چکے ہیں کہ ہر نامیاتی جسم میں ایک داخلی شعور داخل ہوتا ہے جو اس کی نشو و نما کو خاص سمت میں موڑتا ہے اور ابتدا سے انتہا تک اس کی میکانکی ارتقاء کا موجب بنتا ہے۔ انہوں نے اس شعور کو قوّتِ حیات (LIFE - FORCE) کا نام دیا، ذہنی شعور کی کچھ صفات بھی اس سے وابستہ کیں۔ لیکن ماہرینِ طبیعیات کی طرح اس کے بعد آنے والے اس نتیجہ کو نہیں مانتے کہ یہی قوتِ حیات خدا تعالیٰ کی مرضی یا مشیّتِ تخلیق ہے جو ارتقا کے حیوانی مرحلے پر خاص شکل میں ظاہر ہوئی۔ ان دونوں گروہوں کے بعد ماہرین نفسیات کی طرف آیئے۔ وہ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان میں نصب العین کے لئے فطری لگن پائی جاتی ہے۔ بعض اس صداقت کو بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ اس خواہش کا منتہائے مطلوب انسان کو ایک بہترین اور مکمل ترین نظریہ کے نقطۂ عروج تک پہنچانا ہے۔ لیکن اس گروہ کے کسی بھی فرد نے اسی امر سے منسلک اس اگلے نتیجہ تک پہنچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ایک بہترین اور مکمل نظریہ — خدا کے تصور کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ کہ یہ خُدا کی مرضی یا ارادۂ تخلیق ہے جس نے خود کو ارتقائی عمل کے روپ میں ظاہر کیا اور جس کی خواہش ہے کہ انسانی معاشرہ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا تکمیل اور حُسن کے آخری درجہ پر پہنچ جائے۔

ایک ماہر طبیعیات کہہ سکتا ہے کہ میں مادہ کی حقیقت کے متعلق اس کی حسابی نوعیت، جو میں نے دریافت کی ہے، کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔ مجھے اس میں کوئی اخلاقی خوبی محسوس نہیں ہوتی۔ میں الہامی تعلیمات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اپنے علم کی خامیاں دور نہیں کرنا چاہتا، گو میں الہام پر یقین رکھتا ہوں۔ ایک ماہر حیاتیات کہہ سکتا ہے کہ اسے قوتِ حیات کی ان صفات کا علم نہیں، جو ذاتِ الٰہی سے منسوب ہیں اور یہ فرض کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ الہام اور انکشاف اللہ کے اختیار میں ہے۔ ایک ماہرِ نفسیات بھی اسی طرح کا جواب دے کر الہام کو ماننے سے انکار کر سکتا ہے۔ تاہم اگر ماہرین طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات مادہ کے حسابی ذہن کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ارادۂ تخلیق کو مادی، حیوانی اور انسانی ارتقاء کا سبب قرار دیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ نظریہ بے شمار حقائق کو بے نقاب کرتا ہے اور مادہ، حیات اور شعور کے متعلق علمی حقائق کی نئی نئی راہیں کھولتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ سائنس کی مختلف شاخوں کو کائنات سے متعلق ایک مربوط اور ہم آہنگ علم میں مرتب کر سکتے تھے۔ یہ علم نہ صرف پوری انسانیت کے لئے ...... (COMMON WELTANSCHUUNG) ثابت ہوتا بلکہ مختلف اقوامِ عالم کو خُدا کے واحد کنبے میں متحد کر دیتا۔ لیکن بُرا ہو اس تعصب، بے عقلیت اور خرد کی نامسلمانی کا، اس نے ان تینوں گروہوں کو حقیقت تک پہنچنے کے باوجود اسے قبول کرنے سے باز رکھا۔

اس ساری بحث سے میری مراد یہ ہے کہ سیکولر سائنسی علم کے ارتقاء میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں الہام کے سب سے اہم حقائق، جو دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں مشترک ہیں، یعنی خُدا کا تصور اور سائنٹیفک علم، ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایک دوسرے کو اپنی زبردست استدلالی مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ وہاں یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے سائنس کونسی ہے اور الہام کونسا۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد سائنس اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک دوسرا جزو یعنی تصورِ الٰہی اس کا ساتھ نہ دے۔ اب صورت یہ ہے کہ ہماری سائنس مذکورہ مقام پر پہنچ چکی ہے، جب تک خُدا کے تصور کو اس میں سمویا نہ جائے، یہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خُدا کا تصور کوئی ڈھکوسلا یا من گھڑت افسانہ نہیں، ایک مسلّمہ سائنسی حقیقت ہے جو سائنس کی دوسری سچائیوں کی تائید و تشریح کرتی ہے، انہیں منضبط کرتی اور روشنی بخشتی ہے۔ اُن کی خامیوں کو دُور کرتی اور نئی حقیقتوں کا انکشاف کرتی ہے۔

تمام انسانوں میں فطری طور پر ایک دوسرے کے لئے محبت کے بے پناہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ امن اور اتفاق سے ایک متحدہ کنبہ کی طرح جینے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی جملہ سرگرمیوں کی قوّتِ محرکہ ایک ہی ہے جسے ایک احسن اور مکمل نظریے یعنی ذاتِ خُداوندی کے کے تصوّر سے محبّت کی خواہش کہتے ہیں۔ بنی نوع انسان تفریق کا شکار اس لئے ہوئی کہ ماہرینِ تعلیم، معلّمینِ اخلاق اور اہلِ قلم نے خُدا کے تصوّر کو ان کے ذہنوں سے مسخ کر دیا ہے۔ حالانکہ یہی وہ واحد نظریہ ہے جو انہیں لازوال مسرّت اور اطمینان بخش سکتا ہے۔ ان کے تصوّرِ حیات سے اس نظریہ کے نکل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اولادِ آدم ہزاروں گروہوں میں بٹ گئی۔ ہر گروہ نے معبودِ حقیقی کو چھوڑ کر نسل، رنگ، وطن، زبان یا کسی سیاسی مسلک مثلاً جمہوریت، اشتراکیت اور اشتمالیت میں سے کسی ایک کو خُدا بنا لیا اور اس کی چاہت میں اس حد تک بڑھ گیا کہ اسے پوری کائنات کا مختلہ بنانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ جنہوں نے ان کے مسلک کو پسند نہ کیا ان کے دشمن بن گئے۔

اپنے معاندانہ عزائم کو چھپانے کے لئے کوئی دلکش نظریات کا سہارا لیتا ہے، کوئی عیارانہ پروپیگنڈے، شیریں الفاظ، معاہدوں اور امدادی پروگراموں کی آڑ میں اپنا مطلب حل کرتا ہے۔ گذشتہ دو عظیم جنگوں میں ان کی باہمی رقابت اور دشمنی کے نتائج ہم دیکھ چکے ہیں اور اب تیسری ایٹمی جنگ کے بادل دنیا پر منڈلا رہے ہیں۔ اگر یہ جنگ شروع ہو گئی تو پوری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اس سے نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ دنیا بھر کے مرد و زن اس فطری نظریۂ حیات کو اپنا لیں جو ان کے اتحاد و اتفاق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے کہ علم و عرفان کو فکری لادینیت سے پاک کیا جائے۔ انسانی علوم اور عقل و شعور سے جھوٹے اور خود ساختہ خُداؤں کا تصوّر خارج کیا جائے اور انسان صرف خدا سے رشتہ جوڑ لیں۔ مختلف معاشروں کے درمیان پائے جانے والے مذہبی اختلافات اس راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہیں۔ کیونکہ اس منزل تک ہم ان مناقشات کو ہاتھ لگائے بغیر بھی پہنچ سکتے ہیں۔ دوسرے انسانیت کی نصف سے زیادہ تعداد خدا کی ذات اور اس کی صفات پر ایمان رکھتی ہے یہ چیز بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

اس معاملے میں مغربی مفکرین سے رہنمائی کی توقع کرنا عبث ہے۔ یہ ان کے بس کا روگ نہیں، وہ اس مقام سے آگے نہیں بڑھ سکتے جہاں ان کے علم و فضل کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ انسانی فطرت میں نظریات جو اہمیت رکھتے ہیں، اُسے وہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ کیونکہ یہ چیز ان کی خود ساختہ تہذیب اور تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ انہیں اپنی اس کوتاہ نظری اور کج فہمی کا اس وقت تک احساس نہیں ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گا جب تک ان کی ثقافت کا جنازہ نہیں نکل جاتا۔ میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ آج دنیا جس فکری انتشار اور ذہنی خلفشار سے دوچار ہے، اس میں اہل پاکستان اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال کا دیا ہوا یہ جامع نظریہ ہمارے پاس موجود ہے کہ

"مقاصد کی تڑپ حقیقی ہوتی ہے۔ وہی انسان کی جملہ سرگرمیوں کو مہمیز کرتی ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ تمام سائنسی علوم سے فکری لادینیت کے جراثیم کو فنا کر دے"۔

یہ ایک لافانی اور غیر متزلزل نظریہ ہے اور اس قابل ہے کہ ہر طبقۂ فکر کے ذہنی چیلنج کا مقابلہ کر سکے۔ ہم اس نظریے کو اپنا کر دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ اس کے ذریعے ایسا پر امن فکری اور ذہنی انقلاب برپا کر سکتے ہیں جو عالمی اتحاد اور مستقل امن کا ضامن ہوگا۔ ہمیں اس کام کا آغاز اپنے گھر سے کرنا ہوگا۔ وہ اس طرح کہ پرائمری سے لے کر ایم اے تک جملہ درجات میں پڑھائے جانے والے سائنسی علوم کو اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ڈھالا جائے۔ سائنس کو حلقہ بگوش اسلام کیا جائے۔ سائنس کی تدریسی کتب میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ طلبہ کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جائے کہ مادہ، زندگی اور حیوان — تینوں کا خالق ایک ہی ہے۔ مطالعۂ فطرت اور کائنات کے متعلق غور و فکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے خالق حقیقی کو پہچان سکیں۔ ہمارا کوئی فعل اور کوئی سرگرمی خواہ اس کا تعلق اخلاقیات، تعلیم، فہم و دانش، جمالیات، معاشیات، سیاسیات اور قانون سے ہو یا کسی اور شعبۂ حیات سے، اس وقت تک صحیح اور جائز نہیں ہو سکتی جب تک وہ ہمیں خدا کی محبت اور اس کی عبادت کی طرف مائل نہ کرے۔ تدریسی کتاب لکھنے والے اپنے مواد کو کیسے مرتب کریں اور اپنی کتاب قابل عمل بنانے کے لئے انہیں کون کون سے طریقے اپنانے چاہئیں، اس کا تعین ان لوگوں پر چھوڑ دیا جائے جو ان کے نگران اور ہدایت دہندہ ہوں۔

اہل پاکستان کی بھاری اکثریت بارہا مطالبہ کر چکی ہے کہ ملک میں اسلامی نظام تعلیم رائج کیا جائے۔ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ اسلامی نظام تعلیم کیا ہے؟ اس کی تشریح اور تفصیل میں جائے بغیر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کوئی نظام تعلیم اس وقت تک اسلامی نہیں کہلا سکتا جب تک شعوری، ارادی اور ہر ممکن طریقے سے خدا کے اقرار کو اس میں سمو نہ دیا جائے اور خدا کا تصور سائنسی علوم میں خوب رچ بس نہ جائے۔

بعض لوگوں کی طرف سے معیاری اسلامی یونیورسٹی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یونیورسٹی اسی صورت میں مفید اور کارآمد ثابت ہوگی جب مذکورہ بالا مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی کتب مرتّب کی جائیں۔ کیونکہ اسلامی یونیورسٹی میں تو سیکولر اندازِ فکر کا ذرا سا شائبہ بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اگر ہم سیاسی کردار سے متعلق کتابوں سے فکری لادینیت کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ملک کے مختلف طبقات میں پائے جانے والے اختلافات کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور پوری قوم کو ناقابل شکست اتحاد کی لڑی میں پرویا جا سکتا ہے۔

خلاصہ

مقالہ کے آخر میں اس کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ فکری لادینیّت سے حیوانی اور معاشرتی علوم کا ارتقاء رک گیا ہے۔ جو تہذیب جدید کی ناکامی کی دلیل ہے۔ اس تہذیب نے حیاتیاتی علوم کو بھی غلط سمت میں ڈال دیا ہے۔ مادّی علوم کا بھی اس سے بری طرح متاثر ہونے کا امکان ہے۔ موجودہ دور میں عالمی جنگوں کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔

۲۔ فکری لادینیت مغربی مفکرین میں عیسائیت کے مخصوص رجحان سے پیدا ہوئی اور تاریخِ یورپ میں رونما ہونے والے بعض حادثات کے سہارے پروان چڑھی۔

۳۔ فکری لادینیّت نہ صرف پاکستان کی سالمیت اور بقا کے لئے خطرناک ہے بلکہ پورے عالمِ انسانیت کے اتحاد کی راہ میں کمیونزم سے بھی زیادہ بڑی رکاوٹ ہے۔ کیونکہ کمیونزم اسی کی پیداوار ہے اور ذہنی کجی کو دور کئے بغیر کمیونزم کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ جدید دنیا میں پاکستان کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔ اہلِ پاکستان کا نصب العین ذہنی لادینیت کے خاتمہ کے لئے اپنے اندر بڑی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہمیں دُنیا میں ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے اس کا آغاز اپنے گھر سے کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے تعلیمی اداروں میں زیرِ تدریس سائنسی کتب پر اس انداز سے نظرِ ثانی کرنی ہوگی کہ طلبہ کے ذہنوں میں خُدا کا تصور رچ بس جائے۔ علامہ اقبال کی نظم "علم اور عشق میں مکالمہ" ان نظریات کی بڑی خوبصورتی سے تائید کرتی ہے۔ علاّمہ فرماتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم

نگاہم رازدارِ ہفت و چار است   گرفتارِ کمندِ روزگار است
جہاں بینم بایں سو بازکردند   مرا با آنسوئے گردوں چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم
ببازار افگنم رازے کہ دارم

عشق

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است   ہوا آتش گزار و زہر دار است
چو با من یار بودی، نور بودی   بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی   ولیکن در نخِ شیطاں فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز   جہانِ پیر را دیگر جواں ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر
تہ گردوں بہشتِ جاوداں ساز

© rasailojaraid.com